کفِ آئینہ

پروین شاکر

پروین شاکر

مُرادِ پبلیکیشنز • اسلام آباد

نام کتاب ـــــــ کفِ آئینہ

ناشر ـــــــ سیّد مراد علی

مراد پبلی کیشنز، اسلام آباد

مطبع ـــــــ پرنٹ سٹائل، اسلام آباد

فون : ۲۷۰۴۳۲

قیمت ـــــــ

Stockists/Distributors

FEROZSONS (PVT) LIMITED

Telephones:

Rawalpindi : 051 - 563503 - 564273
Lahore : 042 - 6301196 - 8
Karachi : 021 - 570527 - 570534

ISBN: 969 - 8109 - 10 - 2

پیشکش

کتاب زندگی کے سفید و سیاہ ورق الٹتے چلے جا رہے ہیں۔ پروین شاکر کو ہم سے جدا ہوئے دو برس ہو گئے۔ "کف آئینہ" پروین شاکر کا پانچواں اور آخری شعری مجموعہ ہے جو ان کی بہن نسرین شاکر کی زیر نگرانی شائع ہوا اور پروین کی دوسری برسی کے موقع پر پیش کیا جا رہا ہے۔ اپنی وفات سے قبل وہ اس مجموعہ کو ترتیب دے رہی تھیں۔ "کف آئینہ" کا نام بھی خود ان ہی کا رکھا ہوا ہے۔ ان کی المناک موت کے بعد ان کی جو بیاضیں دستیاب ہوئیں وہ محترمہ پروین قادر آغا نے سنبھال لیں۔ بعد میں یہ مسودات تدوین و ترتیب کے لیے جناب مظہرالاسلام کے سپرد کر دیے گئے جنہوں نے ڈاکٹر توصیف تبسم کی اعانت سے اس کتاب کو آخری شکل دی۔ ان بیاضوں میں کچھ ایسا کلام بھی موجود تھا جو پہلے ہی پروین شاکر کے دوسرے مجموعوں میں شائع ہو چکا تھا۔ چنانچہ مرتبین نے ایسے کلام کے اعادہ و تکرار سے بچنے کے لیے، سب سے پہلے اس کو الگ کیا۔ جو کلام مختلف رسائل میں شائع ہو چکا تھا جہاں تک ہو سکا، اصل مسودہ اور رسائل میں شائع شدہ نظم و غزل کا موازنہ بھی کیا گیا اور جہاں کوئی تبدیلی نظر آئی، مطبوعہ صورت کو بوجوہ ترجیح دی گئی۔ پروین شاکر چونکہ ہمارے عہد کی مقبول اردو شاعرہ ہیں، اسی لیے مرتبین کی یہی کوشش رہی کہ جہاں تک ہو سکے، ان کے کلام کو محفوظ کر دیا جائے۔ چنانچہ آپ کو اس کتاب میں ان کی مختصر نا تمام غزلیں اور کچھ متفرق اشعار بھی دیکھنے کو ملیں گے۔ قارئین سے التماس ہے کہ اگر ان کے علم میں پروین شاکر کا ایسا کلام ہو جو اس آخری مجموعہ میں شامل ہونے سے رہ گیا ہے تو وہ از راہ کرم اس کی نشان دہی ضرور فرما دیں تاکہ کتاب کی آئندہ اشاعت میں اس کمی کو پورا کیا جا سکے۔

اس کتاب کے ناشرین، جناب مظہرالاسلام، ڈاکٹر توصیف تبسم اور جناب امجد اسلام امجد کے ممنون ہیں کہ انہوں نے اس کام کو جو ان کے سپرد کیا گیا تھا، بہت ذمہ داری اور محنت سے پایہ تکمیل کو پہنچایا۔ اگر ان کا تعاون حاصل نہ ہوتا تو اس کتاب کی اشاعت موجودہ شکل میں شاید ممکن نہ ہوتی۔

مراد پبلی کیشنز اسلام آباد

ترتیب

غزل

پت جھڑ سے ہے گلہ نہ شکایت ہوا سے ہے
پھولوں کو کچھ عجیب محبت ہوا سے ہے

سرشارئ شگفتگئ گُل کو کیا خبر
منسوب ایک اور حکایت ہوا سے ہے

رکھا ہے آندھیوں نے ہی ہم کو کشیدہ سر
ہم وہ چراغ ہیں جنہیں نسبت ہوا سے ہے

اس گھر میں تیرگی کے سوا کیا رہے جہاں
دل شمع پر ہیں اور ارادت ہوا سے ہے

بس کوئی چیز ہے کہ سلگتی ہے دل کے پاس
یہ آگ وہ نہیں جسے صُحبت ہوا سے ہے

صر صر کو اذن ہو جو صبا کو نہیں ہے بار
کنجِ قفس میں زیست کی صورت ہوا سے ہے

گلچیں کو ہی خرام صبا سے نہیں ہے خار
اب کے تو باغباں کو عداوت ہوا سے ہے

خوشبو ہی رنگ بھرتی ہے تصویرِ باغ میں
بزمِ خبر میں گل کی سیادت ہوا سے ہے

دستِ شجر میں رکھے کہ آکر بکھیر دے
آئینِ گل میں خاص رعایت ہوا سے ہے

اب کے بہار دیکھیے کیا گل کھلائے گی
دلدادگانِ رنگ کو وحشت ہوا سے ہے

غزل

بہت رویا وہ ہم کو یاد کر کے
ہماری زندگی برباد کر کے

پلٹ کر پھر یہیں آجائیں گے ہم
وہ دیکھے تو ہمیں آزاد کر کے

رہائی کی کوئی صورت نہیں ہے
مگر ہاں منّتِ صیاد کر کے

بدن میرا چھوا تھا اس نے لیکن
گیا ہے روح کو آباد کر کے

ہر آمر طول دینا چاہتا ہے
مقرر ظلم کی معیاد کر کے

غزل

چلنے کا حوصلہ نہیں، رکنا محال کر دیا
عشق کے اس سفر نے تو مجھکو نڈھال کر دیا

اے مری گل زمیں تجھے چاہ تھی اک کتاب کی
اہلِ کتاب نے مگر کیا ترا حال کر دیا

ملتے ہوئے دلوں کے بیچ اور تھا فیصلہ کوئی
اس نے مگر بچھڑتے وقت اور سوال کر دیا

اب کے ہوا کے ساتھ ہے دامن یار منتظر
بانوئے شب کے ہاتھ میں رکھنا سنبھال کر دیا

ممکنہ فیصلوں میں ایک، ہجر کا فیصلہ بھی تھا
ہم نے تو ایک بات کی، اس نے کمال کر دیا

میرے لبوں پہ مُہر تھی، پر شیشہ رُو نے تو
شہر کے شہر کو مرا واقفِ حال کر دیا

چہرہ و نام ایک ساتھ آج نہ یاد آسکے
وقت نے کس شبیہ کو خواب و خیال کر دیا

مدّتوں بعد اس نے آج مجھ سے کوئی گلہ کیا
منصبِ دلبری یہ کیا مجھکو بحال کر دیا

غزل

زباں پہ تذکرۂ بام و در نہیں لاتا
وطن سے کوئی خبر نامہ بر نہیں لاتا

گلاب کو نہ یقیں ہوگا جب تلک صیّاد
ہوا کے طشت میں اک مشتِ پر نہیں لاتا

یہ راہ عشق ہے مقتل سے ہو کے جاتی ہے
سو اس سفر میں کوئی دل میں ڈر نہیں لاتا

تمام بوجھ تو رستے میں جمع ہوتا ہے
ورود سے کوئی رختِ سفر نہیں لاتا

میں جس کے دھیان میں پہروں اداس رہتی ہوں
خیال دل میں مرا لمحہ بھر نہیں لاتا

سوادِ شام! اسیروں میں کون شامل ہے
بلا سبب کوئی نیزے پہ سر نہیں لاتا

غزل

تخت ہے اور کہانی ہے وہی
اور سازش بھی پرانی ہے وہی

قاضئ شہر نے قبلہ بدلا
لیک خطبے میں روانی ہے وہی

خیمہ کش اب کے ذرا دیکھ کے ہو
جس پہ پہرہ تھا، یہ پانی ہے وہی

صلح کو فتح کیا دل میں مگر
اب بھی پیغامِ زبانی ہے وہی

آج بھی چہرۂ خورشید ہے زرد
آج بھی شام سہانی ہے وہی

بدلے جاتے ہیں یہاں روز طبیب
اور زخموں کی کہانی ہے وہی

حجلۂ غم یونہی آراستہ ہے
دل کی پوشاک شہانی ہے وہی

شہر کا شہر یہاں ڈوب گیا
اور دریا کی روانی ہے وہی

غزل

میں اس سے بھلا کہاں ملی تھی
بس خواب میں خواب دیکھتی تھی

سایہ تھا کوئی کنار دریا
اور شام کی ڈوبتی گھڑی تھی

کہرے میں چھپا ہوا تھا جنگل
چڑیا کہیں دور بولتی تھی

لپٹی ہوئی دھند کی ردا میں
اک زرد گلاب کی کلی تھی

اک سبز غبار تھا فضا میں
بارش کہیں سانس لے رہی تھی

بادل کوئی چھو گیا تھا مجھکو
چہرے پہ عجیب تازگی تھی

آنکھوں میں ٹھہر گئی تھی شبنم
اور روح میں نرم روشنی تھی

کیا چیز تھی جو مرے بدن میں
آہستہ آہستہ کھِل رہی تھی

اک گیت ہوا کے ہونٹ پر تھا
اور اس کی زبان اجنبی تھی

اس رات جبینِ ماہ پر بھی
تحریر کوئی قدیم سی تھی

یہ عشق نہیں تھا اس زمیں کا
اس میں کوئی بات سرمدی تھی

غزل

جب ساز کی لے بدل گئی تھی
وہ رقص کی کونسی گھڑی تھی

اب یاد نہیں کہ زندگی میں
میں آخری بار کب ہنسی تھی

جب کچھ بھی نہ تھا یہاں پہ ماقبل
دنیا کس چیز سے بنی تھی

مٹھی میں تو رنگ تھے ہزاروں
بس ہاتھ سے ریت بہہ رہی تھی

ہے عکس، تو آئینہ کہاں ہے
تمثیل یہ کس جہان کی تھی

ہم کس کی زبان بولتے ہیں
گر ذہن میں بات دوسری تھی

تنہا ہے اگر ازل سے انساں
یہ بزم کلام کیوں سجی تھی

تھا آگ ہی گر مرا مقدر
کیوں خاک میں پھر شفا رکھی تھی

کیوں موڑ بدل گئی کہانی
پہلے سے اگر لکھی ہوئی تھی

دو شعر

خلقت نہیں ہے ساتھ تو پھر بخت بھی نہیں
کچھ دن یہی رہے گا تو یہ تخت بھی نہیں

مایوس ہو کے دیکھ رہے ہیں خلا میں گھر
اتنی تو یہ زمین مگر سخت بھی نہیں

نظم

سوادِ زندگانی میں
اک ایسی شام آتی ہے
کہ جس کے سرمئی آنچل میں
کوئی پھول ہوتا ہے
نہ ہاتھوں میں کوئی تارہ!
جو آکر بازوؤں میں تھام لے
پھر بھی
رگ و پے میں کوئی آہٹ نہیں ہوتی
کسی کی یاد آتی ہے
نہ کوئی بھول پاتا ہے
نہ کوئی غم سلگتا ہے
نہ کوئی زخم سلتا ہے

گلے ملتا ہے کوئی خواب
نے کوئی تمنا ہاتھ ملتی ہے
سوادِ زندگانی میں
اک ایسی شام آتی ہے
جو خالی ہاتھ آتی ہے!

یہ میرے ہاتھ کی گرمی

یہ میرے ہاتھ کی گرمی
جسے چھو کر
تمہاری آنکھ میں حیرت کے ڈورے ہیں
کہ اس سے قبل جب بھی تم نے میرا ہاتھ تھاما
برف کا موسم ہی پایا تھا
یہ موسم میرے اندر کتنے برسوں سے فروکش تھا
بہار آتی تھی
اور میرے دریچوں پر کبھی دستک نہ دیتی تھی
گلابی بارشیں
میرے لئے ممنوع تھیں
اور صُبح کی تازہ ہوا کا ذائقہ
میں بھول بیٹھی تھی

مرے ملبوس سے سب گرم رنگوں کو شکایت تھی
مجھے بس برف کی چادر پہننے کی اجازت تھی
مگر جاناں!
تمہارے ساتھ نے تو روح کا موسم بدل ڈالا
یہاں اب رنگ کا تہوار ہے
خوشبو کا میلہ ہے
مرا ملبوس اب گہرا گلابی ہے
مرے خوابوں کا چہرہ ماہتابی ہے
مرے ہاتھوں کی حدّت آفتابی ہے
جسے چھو کر.......

نظم

پہلے بھی یہ دل ہجر سے بے حال ہوا ہے
پہلے بھی بچھڑنے کی سزا پائی ہے اس نے
رخصت کی اذیت میں جو شدت ہے، سہی ہے
آیا ہے بہت یاد کسی چشم کا جادو
خود سے بہت آئی کسی ملبوس کی خوشبو
کھینچا ہے بہت قلب کو گزرے ہوئے کل نے
دن بھر کبھی دوری نے زبوں حال رکھا ہے
رخصت کی گھڑی ٹھہر گئی روح میں جیسے!

اس بار جو آیا ہے مگر، ہجر کا موسم
اس میں دلِ بیمار کی وحشت ہی الگ ہے
مٹی سے جدائی کی حکایت ہی الگ ہے
کچھ دیر کی تاخیر جو ہوتی ہے وطن سے
لگتا ہے کہ اب جان نکل جائے گی تن سے!

نہ میں نے چاند دیکھا

نہ میں نے چاند دیکھا
اور نہ کوئی تہنیت کا پھول کھڑکی سے اٹھایا
مرا ملبوس اب بھی ملگجا ہے
حنا سے ہاتھ خالی
اور چوڑی سے کلائی
نہ میرے پاس تھے تم
اور نہ میرے شہر سے گزرے
میں کیا افشاں لگاتی
مانگ میں سیندور بھرتی
رنگ اور خوشبو پہنتی
چاند کی جانب نظر کرتی
کہ میری لذّت دیدار تو تم ہو!
مرا تہوار تو تم ہو!

نظم

یہ بارش خوبصورت ہے
اک عرصے بعد
میری روح میں
سیراب ہونے کی تمنا جاگ اٹھی ہے
مگر بادل کے رستے میں
بہت سے پیڑ آتے ہیں
میں پل بھر کے لئے شاداب ہوں
اور اپنی باقی عمر
پھر صحرا میں کاٹوں؟

میں اپنی پیاس پر راضی رہوں گی
مرے آنسو مرے دل کی کفالت کے لئے کافی رہیں گے

مگراس دل کی ویرانی

تمہارا ہاتھ میرے ہاتھ میں ہے
اور اسکی خوش اثر حدّت
مرے اندر طلسمی رنگ پھولوں کی نئ دنیا کھلانے میں مگن ہے
تمہارے لب پہ میرے نام کا تارہ چمکتا ہے
تو مری روح ایسے جگمگا اٹھتی ہے
جیسے آئینے میں چاند اتر آئے
مری پلکوں سے آنسو چوم کر
تم نے انہیں موتی بنانے کی جو ضد کی ہے
وہ ضد مجھکو بہت اچھی لگی ہے
بہت خوش ہوں
کہ میرے سر پہ چادر رکھنے والا ہاتھ
میرے ہاتھ میں پھر آگیا ہے

یہ پھول اور یہ ستارے اور یہ موتی
مجھکو قسمت سے ملے ہیں
اور اتنے ہیں کہ گنتی میں نہیں آتے
مگر اس دل کی ویرانی ------!
مگر اس دل کی ویرانی ------!

غزل

سلا رہا تھا نہ بیدار کر سکا تھا مجھے
وہ جیسے خواب میں محسوس کر رہا تھا مجھے

یہی تھا چاند اور اسکو گواہ ٹھہرا کر
ذرا سا یاد تو کر تُو نے کیا کہا تھا مجھے

تمام رات مری خواب گاہ روشن تھی
کسی نے خواب میں اک پھول دے دیا تھا مجھے

وہ دن بھی آئے کہ خوشبو سے میری آنکھ کھلی
اور ایک رنگ حقیقت میں چھُو رہا تھا مجھے

میں اپنی خاک پہ کیسے نہ لوٹ کر آتی
بہت قریب سے کوئی پکارتا تھا مجھے

درونِ خیمہ ہی میرا قیام رہنا تھا
تو میرِ فوج نے لشکر میں کیوں لیا تھا مجھے

غزل

تھک گیا ہے دلِ وحشی مرا فریاد سے بھی
جی بہلتا نہیں اے دوست تری یاد سے بھی

اے ہوا کیا ہے جو اب نظمِ چمن اور ہوا
صید سے بھی ہیں مراسم ترے، صیاد سے بھی

کیوں سرکتی ہوئی لگتی ہے زمیں یاں ہر دم
کبھی پوچھیں تو سبب شہر کی بنیاد سے بھی

برق تھی یا کہ شرارِ دل آشفتہ تھا
کوئی پوچھے تو مرے آشیاں برباد سے بھی

بڑھتی جاتی ہے کشش وعدہ گہِ ہستی کی
اور کوئی کھینچ رہا ہے عدم آباد سے بھی

غزل

جشن سا آٹھ پہر دل میں ہے
کتنی یادوں کا شہر دل میں ہے

تجھ سے ملنے کی سرخوشی کے ساتھ
ایک اداسی کی لہر دل میں ہے

ہے ازل سے رخِ فلک نیلا
کس قیامت کا زہر دل میں ہے

دھوپ نکلی ہوئی ہے برف کے بعد
کون یہ صبح چہر دل میں ہے

خشک ہوتی نہیں کسی موسم
غم کی اک ایسی نہر دل میں ہے

حیف ہے ایسی میزبانی پر
حسرتِ سیرِ دہر دل میں ہے

غزل

حرفِ تازہ نئی خوشبو میں لکھا چاہتا ہے
باب اک اور محبت کا کھُلا چاہتا ہے

ایک لمحے کی توجہ نہیں حاصل اسکی
اور یہ دل کہ اسے حد سے سوا چاہتا ہے

اک حجابِ تہہِ اقرار ہے مانع ورنہ
گل کو معلوم ہے کیا دستِ صبا چاہتا ہے

ریت ہی ریت ہے اس دل میں مسافر میرے
اور یہ صحرا ترا نقشِ کفِ پا چاہتا ہے

یہی خاموشی کئی رنگ میں ظاہر ہوگی
اور کچھ روز، کہ وہ شوخ کھُلا چاہتا ہے

رات کو مان لیا دل نے مقدر لیکن
رات کے ہاتھ پہ اب کوئی دیا چاہتا ہے

تیرے پیمانے میں گردش نہیں باقی ساقی
اور تری بزم سے اب کوئی اٹھا چاہتا ہے

غزل

چپ رہتا ہے وہ اور آنکھیں بولتی رہتی ہیں
اور کیا کیا بھید نظر کے کھولتی رہتی ہیں

وہ ہاتھ مرے اندر کیا موسم ڈھونڈتا ہے
اور انگلیاں کیسے خواب ٹٹولتی رہتی ہیں

اک وقت تھا جب یہی چاند تھا اور سناٹا تھا
اور اب یہی شامیں موتی رولتی رہتی ہیں

یاد آتی ہیں اسکی پیار بھری باتیں شب بھر
اور سارے بدن میں امرت گھولتی رہتی ہیں

غزل

وقتِ رخصت آگیا، دل پھر بھی گھبرایا نہیں
اسکو ہم کیا کھوئیں گے جس کو کبھی پایا نہیں

زندگی جتنی بھی ہے اب مستقل صحرا میں ہے
اور اس صحرا میں تیرا دُور تک سایہ نہیں

میری قسمت میں فقط دردِ تہہ ساغر ہی ہے
اوّل شب جام میری سمت وہ لایا نہیں

تیری آنکھوں کا بھی کچھ ہلکا گلابی رنگ تھا
ذہن نے میرے بھی اب کے دل کو سمجھایا نہیں

کان بھی خالی ہیں میرے اور دونوں ہاتھ بھی
اب کے فصلِ گل نے مجھکو پھول پہنایا نہیں

یہ کیسا خلا ہے

یہ کیسا خلا ہے
جو خوابوں کے رستے مری روح میں آگیا ہے
میں جس پھول بن میں
ہری گھاس پر تتلیاں چن رہی تھی
وہ فرشِ گیہ میرے قدموں سے کیسے جدا ہو گیا
میں جس آسماں کے
ستاروں میں اپنا ستارہ الگ کر رہی تھی
وہ تاروں بھری چھت مرے سر سے کیوں ہٹ گئی
زمیں پر ہوں اور میں نہ زیرِ فلک
نہ دھڑکا ہے دل کو نہ کوئی کسک
ترے ساتھ ہوں اور نہ تیرے بغیر
جیئے جا رہی ہوں میں اپنے بغیر

ہوا جامِ صحت تجویز کرتی ہے

مجھے معلوم تھا
یہ دن بھی دکھ کی کوکھ سے پھوٹا ہے
میری ماتمی چادر
نہیں تبدیل ہو گی آج کے دن بھی
جو راکھ اڑتی تھی خوابوں کی بدن میں
یونہی آشفتہ رہے گی
اور اداسی کی یہی صورت رہے گی!
میں اپنے سوگ میں ماتم کناں
یوں سر بہ زانو رات تک بیٹھی رہوں گی
اور مرے خوابوں کا پُرسہ آج بھی کوئی نہیں دے گا----!
مگر یہ کون ہے
جو یوں مجھے باہر بلاتا ہے
بڑی نرمی سے کہتا ہے

کہ اپنے حجرۂ غم سے نکل کر باغ میں آؤ
ذرا باہر تو دیکھو!
دور تک سبزہ بچھا ہے
اور ہری شاخوں پہ نارنجی شگوفے مسکراتے ہیں
ملائم سبز پتوں پر پڑی شبنم
سنہری دھوپ میں، ہیرے کی صورت جگمگاتی ہے
درختوں میں چھپی ندّی
بہت دھیمے سروں میں گنگناتی ہے
چمکتے زرد پھولوں سے لدی، ننھی پہاڑی کے عقب میں
نقرئی چشمہ خوشی سے کھلکھلاتا ہے
پرند خوش گلو
شاخِ شگفتہ پر چہکتا ہے
گھنے جنگل میں بارش کا غبار سبز
سطحِ شیشۂ دل پر
ملائم انگلیوں سے مرحبا کے لفظ لکھتا ہے

کوئی آتا ہے
آکر چادرِ غم کو بڑی آہستگی سے
میرے شانوں سے ہٹا کر
سات رنگوں کا دوپٹہ کھول کر مجھکو اڑھاتا ہے
میں کھُل کر سانس لیتی ہوں
مرے اندر
کوئی پیروں میں گھنگھرو باندھتا ہے
رقص کا آغاز کرتا ہے
مرے کانوں کے آویزوں کو یہ کس نے چھُوا
جس سے لویں پھر سے گلابی ہو گئی ہیں
کوئی سرگوشیوں میں پھر سے میرا نام لیتا ہے
فضا کی نغمگی آواز دیتی ہے
ہوا جامِ صحت تجویز کرتی ہے

نظم

گلہ کیسا

اسیرِ شامِ تنہائی سے یہ آخر گلہ کیسا
تجھے تو علم تھا زنجیر کا میری
جو پیروں میں بھی ہے
اور روح پر بھی
میں اپنے بخت کی قیدی ہوں
میری زندگی میں
نرم آوازوں کے جگنو کم چمکتے ہیں
فصیلِ شہرِ غم پر خوش صدا طائر
کہاں آکر ٹھہرتے ہیں
تری آواز کا ریشم میں کیسے کاٹ سکتی تھی
مرے بس میں اگر ہوتا

تو ساری عمر
اس ریشم سے اپنے خواب بُنتی
اور اس رم جھم کے اندر بھیگتی رہتی!
تجھے تو میرے دکھ معلوم تھے جاناں!
یہ کس لہجے میں تُو رخصت ہوا ہے!

ایک ساؤنڈ پروف نظم

بہت خوش شکل ہے یہ گھر
طلسمی ہے فضا اس کی
دریچوں کا ہے رخ دریا کی جانب
اور دروازے بھی اکثر باغ کے پہلو میں کھلتے ہیں!
عروسِ نو کے خوابوں کی طرح نقشین ہے ہر کمرہ
اور ان کے وسط میں المانوی شمعیں سحر تک جھلملاتی ہیں
بہت آراستہ مہمان خانے میں
طلائی قاب میں رکھے ہوئے اثمارِ تازہ، سبز و عنابی
منقش جامِ سیمیں میں شراب کہربائی
اور کف دہلیز سے لے کر
مکینوں کے نگاریں حجلہ گاہِ خواب
اور دیوان خانے تک

بچھے غالیچۂ شیراز و روما
آپ کے قدموں کی آہٹ اس طرح سے جذب کرتے ہیں
کہ جیسے خانہ زاد تاج
محلوں میں چھپے رازوں کو اپنے گنگ سینوں میں۔
مکیں سرگوشیوں میں بات کرتے ہیں
صدائے شام کا زخمی پرندہ
شیشۂ در سے برابر سر کو ٹکراتا ہے
لیکن باریابی کی کوئی صورت نہیں بنتی
دریچوں پر کبھی
بارش کی ننھی سی ہتھیلی کی جھلک
مجھ کو دکھائی دے بھی جاتی ہے
مگر دستک نہیں آتی

جہاں میں ہوں
وہاں آواز کو رستہ نہیں ملتا!

یہاں سے ایک شب کے فاصلے پر
دور آزادی کی مورت کے جلو میں
شاہراہ شرقِ اوّل پر
طلسمی رنگ، جادوئی فضا
اک اور بستی ہے
جہاں دنیائے سوئم کے
کسی کوچے سے آتے بین کو
پروانۂ راہداریٔ عظمیٰ نہیں ملتا
جہاں ہم ہیں
وہاں آواز کو رستہ نہیں ملتا!

نظم

خوشبو میں بسا ہوا یہ لہجہ
دستک مرے دل پہ دے رہا ہے
اور ڈھونڈ رہا ہے میرے اندر
اک شاخِ بہار رنگ جس پر
اقرار کے پھول کھل رہے ہوں!

میں کیسے کروں یہ درکشادہ
اس پر تو وہ قفل پڑ چکا ہے
جس کے لئے سارے اسم بیکار
یہ میرے ستارے کی طرح ہے
تاریک، اداس، غیر آباد!

اے میرے خدا، مرے بدن میں
ہمت نہیں اب شکستگی کی
شیشے کی طرح ہے اس کا دل بھی
اک ٹھیس سے ٹوٹنے کا ڈر ہے

مالک ہے تو آب و باد و گل کا
قادر ہے ہماری قسمتوں پر
اتنی سی دعا ہے میری تجھ سے
یا اس کے ارادے کو بدل دے!
یا میرے ستارے کو بدل دے!

غزل

اک عجیب رو تھی خیال میں مرے آ گئی
کسی اور قرن سے حال میں مرے آ گئی

یہ تری نگاہِ ستارہ ساز کا ہے اثر
یہ جو روشنی خد و خال میں مرے آ گئی

مری عمر میں نہیں دکھ میں فرق پڑا ہے یہ
یہ کمی سی جو مہ و سال میں مرے آ گئی

وہ جواب دے کے بھی دیر تک رہا سوچتا
کوئی بات ایسی سوال میں مرے آ گئی

ترے ساتھ اڑنے کا سوچ کر ہی میں کھِل گئی
کوئی لہر سی پر و بال میں مرے آ گئی

کبھی زندگی میں منافقت نہیں کر سکی
یہ کمی بھی فردِ میں مرے آگئی

کبھی پیچھے نظم کے بھاگنا مجھے پڑ گیا
کبھی خود یہ تیتری جال میں مرے آگئی

غزل

خوشی کی بات ہے یا دکھ کا منظر دیکھ سکتی ہوں
تری آواز کا چہرہ میں چھو کر دیکھ سکتی ہوں

ابھی تیرے لبوں پہ ذکرِ فصلِ گل نہیں آیا
مگر اک پھول کھلتے اپنے اندر دیکھ سکتی ہوں

مجھے تیری محبت نے عجب اک روشنی بخشی
میں اس دنیا کو اب پہلے سے بہتر دیکھ سکتی ہوں

کنارہ ڈھونڈنے کی چاہ تک مجھ میں نہیں ہوگی
میں اپنے گرد اک ایسا سمندر دیکھ سکتی ہوں

خیال آتا ہے آدھی رات کو جب بھی ترا دل میں
اُترتا اک صحیفہ اپنے اوپر دیکھ سکتی ہوں

وصال و ہجر اب یکساں ہیں، وہ منزل ہے الفت میں
میں آنکھیں بند کر کے تجھکو اکثر دیکھ سکتی ہوں

ابھی تیرے سوا دنیا بھی ہے موجود اس دل میں
میں خود کو کس طرح تیرے برابر دیکھ سکتی ہوں

غزل

بھولا نہیں دل عتاب اس کے
احسان ہیں بے حساب اس کے

آنکھوں کی ہے ایک ہی تمنا
دیکھا کریں روز خواب اس کے

ایسا کوئی شعر کب کہا ہے
جو ہو سکے انتساب اس کے

اپنے لئے مانگ لوں خدا سے
حصے میں جو ہیں عذاب اس کے

ویسے تو وہ شوخ ہے بلا کا
اندر ہیں بہت حجاب اس کے

تین شعر

پیراہنِ غم سیا ہے کس نے
خوابوں کو کفن دیا ہے کس نے

جب گھر میں رکھی ہوئی ہو میّت
پھر جشن بپا کیا ہے کس نے

اوروں پہ جو لوگ سائباں تھے
بے گھر انہیں کر دیا ہے کس نے

غزل

دل میں آئی رات
چھوٹی سی اک بات

اب کے پروائی
لائی کیا سوغات

پھولوں بھرا رستہ
اور کسی کا سات

اس نے تھام لیا
چوم کے میرا ہات

آنگن میں اتری
تاروں کی بارات

جیون میں آئی
پورے چاند کی رات

تن من جل تھل ہے
یہ کیسی برسات

اس کی یاد میں گم
میں ، خوشبو اور رات

غزل

جیسے مشامِ جاں میں سمائی ہوئی ہے رات
خوشبو میں آج کس کی نہائی ہوئی ہے رات

سرگوشیوں میں بات کریں ابر و باد و خاک
اس وقت کائنات پہ چھائی ہوئی ہے رات

ہر رنگ جس میں خواب کا گھلتا چلا گیا
کس رنگ سے خدا نے بنائی ہوئی ہے رات

پھولوں نے اس کا جشن منایا زمین پر
تاروں نے آسماں پہ سجائی ہوئی ہے رات

وہ چاند چھپ چکا ہے مگر شہر دید نے
اب تک اسی طرح سے بسائی ہوئی ہے رات

صبحِ جمالِ یار کے جادو کو دیکھ کے
ہم نے نظر سے اپنی چھپائی ہوئی ہے رات

نظم

زمستاں کی اک ریشمین شام تھی
مرے گھر کے سارے دریچے
تری نرم دستک کے یوں منتظر تھے
کہ جیسے ازل سے تری آہٹوں سے شناسا ہیں
خواب گہ سے فضا
کمرۂ میزبانی تلک
تازہ نرگس کی خوشبو سے گلنار تھی
تو نے دہلیز پر پاؤں رکھا ہی تھا
کہ مرے گھر کے سارے دیے جل اٹھے
رنگ اور روشنی اور خوشبو کا سیلاب تھا
جو بہائے لئے جا رہا تھا ہمیں!

دیر تک گفتگو سے چراغاں رہا
موسموں پر'
سیاست پہ
کارِ جہاں اور کار سماوات پر
پر وہ اک لفظ جو
تیرے دل میں کھلا
اور مرے خواب میں
ان چھوا ہی رہا!

نظم

تمہارے جانے کے بعد میں نے
وہ شام آنچل میں باندھ لی
اور اس کی خوشبو کے ساتھ
باقی تمام شب اس طرح بسر کی
کہ جیسے بارش کے بازوؤں میں
بہار کی اوّلین کونپل
تمہارے لہجے کی نرم شبنم
مجھے بھگوتی رہی ہے شب بھر
تمہاری باتوں کی سبز مہکار، اپنے اندر
مجھے سموتی رہی ہے شب بھر
تمہارے ہاتھوں کا لمسِ پیہم
مرے بدن کو گلاب کرتا رہا ہے شب بھر
زمین کو ماہتاب کرتا رہا ہے شب بھر

نظم

جب شام کے ہاتھوں میں
اک جامِ نگاریں ہو
اور رات کے لہجے میں
ہلکا سا سرور آئے
اور اس کی بہت گہری
آنکھوں میں گلابی ہو
اس وقت یہ پیاسا دل
جب بات کرے اس سے
مدہوش نہ ہو کیوں کر
آنکھوں کی طرح جس کی
آواز میں سرخی ہو!

تمہاری ہنسی

یہ تمہاری ہنسی
روشنی سے بھری
چاندنی میں ڈھلی
رنگ سے تازہ رُو
عشق سے مشک بو
جب بھی دل نے سنی
رقص کرنے لگا
روح میں جیسے قوسِ قزح کھنچ گئی

آج بھی اس ہنسی کے وہی رنگ تھے
آج بھی روشنی کی وہی چھوٹ تھی
آج بھی اس کی خوشبو جنوں خیز تھی
پر کوئی بات تھی جس سے خالی تھی یہ
آج تو میری صورت، سوالی تھی یہ

نئے سال کی دعا

خدا کرے کہ نیا سال تیرے دامن میں
وہ سارے پھول کھلا دے
کہ جن کی خوشبو نے
ترے خیال میں شمعیں جلائی رکھی تھیں!

یہ پیاس سماعت کی

حلقومِ سماعت میں
اگ آئے ہیں اب کانٹے
آواز کا اک قطرہ
لیکن نہیں مل پاتا۔
شبنم ترے لہجے کی
کس بن میں اترتی ہے،
نم تیری ہنسی کا اب
کس تن کو بھگوتا ہے۔
میں پیاس سے بیکل ہوں
اور تیرے تکلّم کا
اک گھونٹ نہیں ملتا۔
اس قحطِ صدا میں دل
اب کے نہ کھلے شاید
یہ پیاس سماعت کی
جاں لے کے ٹلے شاید

غزل

صحرا کی طرح تپی ہوئی برف
کیا آگ سے ہے بنی ہوئی برف!

پتھر کی سیاہ رُو سڑک پر
شیشے کی طرح بچھی ہوئی برف

ہے شام کی سرمئی ردا پر
چمپا کی طرح ٹکی ہوئی برف

اندر سے سراپا آگ ہوں میں
باہر سے مگر جمی ہوئی برف

ہیں چست قبا شجر ہی، یا ہے
ہمراہ بدن سلی ہوئی برف

لگتا ہے کہ شب دمک رہی ہے
مہتاب ہے اور کھلی ہوئی برف

مجھ پر کوئی ریت آکے ڈالے
ویرانے میں ہوں پڑی ہوئی برف

غزل

ظلم کے ہاتھوں اذیت میں ہے جس طرح حیات
ایسا لگتا ہے کہ اب حشر ہے کچھ دیر کی بات

روز اک دوست کے مرنے کی خبر آتی ہے
روز اک قتل پہ جس طرح کہ مامور ہے رات

خیمۂ غیر سے منگوائے ہوئے یہ مُخبر
رن پڑے گا تو گھڑی بھر کو نہ دے پائیں گے سات

کس طرح جان سکے طائرکِ نو آموز
کون ہے جال کشا' کون لگائے ہوئے گھات!

آستینوں میں چھپائے ہوئے ہر اک خنجر
اور گفتار کی بابت میں ہیں سب قند و نبات

غزل

سلگ رہا ہے مرا شہر، جل رہی ہے ہوا
یہ کیسی آگ ہے جس میں پگھل رہی ہے ہوا

یہ کون باغ میں خنجر بدست پھرتا ہے
یہ کس کے خوف سے چہرہ بدل رہی ہے ہوا

شریک ہو گئی سازش میں کس کے کہنے پر
یہ کس کے قتل پہ اب ہاتھ مل رہی ہے ہوا

پرندے سہمے ہوئے ہیں درخت خوف زدہ
یہ کس ارادے سے گھر سے نکل رہی ہے ہوا

غزل

نہ بجھ رہی ہے نہ اب کے بھڑک رہی ہے ہوا
ہمارے دل کی طرح سے تپک رہی ہے ہوا

رکھی ہوئی ہے ہر اک گھر کے صحن میں میت
سو وقفے وقفے سے جیسے سسک رہی ہے ہوا

رکھی تھی شہر کی بنیاد کیسے لوگوں نے
یہ کون لوگ ہیں جن میں بھٹک رہی ہے ہوا!

سحر کچھ اور تھا اور اب یہ حال باغ کا ہے
کہ پاؤں رکھتے ہوئے بھی ٹھٹھک رہی ہے ہوا

یہ باغباں ہیں کہ گل چیں، ندیم یا صیاد
کہ ان سے ہاتھ ملاتے جھجک رہی ہے ہوا

بریدہ جانی پہ بھی شہر سانس لیتا ہے
بہت سے لوگوں کے دل میں کھٹک رہی ہے ہوا

غزل

کیوں مجھ پہ ہوا ہے مہرباں تُو
اک ذرّہ خاک، اور کہاں تُو

میں دھوپ کی عادی ہو چلی تھی
کیوں مجھ پہ بنا ہے سائباں تو

میں تیری زمینِ نصف شب ہوں
تاروں بھرا میرا آسماں تو

ایسے ہی ہماری سوچ یکجان
میں نطق ترا، مری زباں تو

تیار ہوں میں سفر کو لیکن
کشتی کا اٹھائے بادباں تو

کتنا بھی ہو میرا سخت لہجہ
دیبا و حریر و پرنیاں تو

اک عام غریبِ شہر ہوں میں
کیا سن کے کرے گا داستاں تو

پتھر میں گلاب دیکھتا ہے
کس درجہ ہے مجھ سے خوش گماں تو

اب تھوڑا سا وقت رہ گیا ہے
ضائع کروں میں، نہ رائیگاں تو

غزل

رکی ہوئی ہے ابھی تک بہار آنکھوں میں
شبِ وصال کا جیسے خمار آنکھوں میں

مٹا سکے گی اسے گردِ ماہ و سال کہاں
کھنچی ہوئی ہے جو تصویرِ یار آنکھوں میں

بس ایک شب کی مسافت تھی اور اب تک ہے
مہ و نجوم کا سارا غبار آنکھوں میں

ہزار صاحبِ رخشِ صبا مزاج آئے
بسا ہوا ہے وہی شہ سوار آنکھوں میں

وہ ایک تھا پہ کیا اس کو جب تہہِ تلوار
تو بٹ گیا وہی چہرہ ہزار آنکھوں میں

ایک خالی دوپہر

میں باہر کی تمازت سے
جھلس کر آئی تو دیکھا
مرے گھر میں بھی ویسی دھوپ میری منتظر تھی!
کسی آواز نے ماتھا مرا چوما
نہ کوئی دلربا لہجہ
مجھے بانہوں میں لے پایا
حصولِ رزق کی گہری مشقت میں
اٹھائے جانے والے زخم پر
کوئی صدا مرہم فشاں تھی
اور نہ کوئی لفظ ہی اس کا رفوگر تھا
میں جس آواز سے لبریز رہتی تھی
اسی کے ایک جرعے کو ترستی تھی
مرے ہاتھوں میں اک ٹوٹی ہوئی پوجا کی تھالی تھی
مری شاموں کی طرح آج میری دوپہر بھی
تجھ سے خالی تھی!

نظم

آغازِ بہار سے ہی اب کے
یہ کیسا گلاب کھل گیا ہے
سارے جنگل میں روشنی ہے
پتے پتے پہ تازگی ہے
ہر نوک گیاہ پہ ہے شبنم
اک نغمگی ہے ہوا کے تن میں
اک رقص کی کیفیت بدن میں

نظم

ترے لہجے میں اب کی بار
ایسی شانتی تھی
جو اک گہرے تذبذب سے نکل کر
ذہن میں اک فیصلے کے بعد آتی ہے
تذبذب سے نکلنا اسقدر آساں نہیں جاناں!
یہ وہ جنگل ہے
جس میں راستے اک دوسرے کو کاٹ دیتے ہیں
مسافر اک قدم آگے بڑھاتا ہے
تو سو خدشات دامن تھام لیتے ہیں
کوئی رستہ دکھانے کا کہاں سوچے
چراغوں کا تو کیا کہنا
یہاں تو جگنوؤں پہ شک گزرتا ہے
سو ایسے گھپ اندھیرے میں
یقیں کی شمع کس نے آکے تیرے دل میں روشن کی
ترے چہرے پہ اب کی بار
کیسی روشنی تھی!

نظم

جان!

کیا بات ہے

کس تذبذب میں ہو

فیصلے پر پہنچنے میں کیا بات مانع ہوئی

اور اگر فیصلے پر پہنچ ہی گئے ہو

تو پھر اس کا دکھ تو نہیں

اور دکھ ہے تو پھر

لوٹنے کی گھڑی

ہاتھ میں ہے ابھی

گرچہ اب شام ہے

اور جنگل قریں

پھر بھی تنہائی کا وقت کٹ جائے گا

راستے میں اب اتنی مسافت نہیں
عمر کی رات کے
آخری پہر میں
میں بھی ہوں
تم بھی ہو!

نظم

"دعا کرنا
مرے حق میں دعا کرنا۔"
بچھڑتے وقت اس نے ایک ہی فقرہ کہا تھا
اسے کیا علم
میرے حرف سے تاثیر کب کی اٹھ چکی ہے!
دعا کا پھول
میرے لب پہ کھلتے ہی
اچانک ٹوٹ جاتا ہے
میں کس خوشبو کو اس کے ہاتھ پر باندھوں
مجھے خوشبو سے ڈر لگنے لگا ہے!

نظم

گلے سے اپنے لگائے مجھ کو
سمیٹ کر اپنے بازوؤں میں
وہ ایک بچے کی طرح مجھ کو تھپک رہا تھا
اور اپنی خواب آفریں سرگوشیوں میں مجھ سے یہ کہہ رہا تھا
ابھی نہ تھکنا!
ابھی نہ تھکنا!

مرے مسافر!
میں جانتی ہوں
ابھی سفر ابتدا ہوا ہے
ابھی مسافت کی حد بھی لکھی نہیں گئی ہے
ابھی تو جنگل میں راستہ ڈھونڈنا پڑے گا

ابھی تو رستے میں شام ہو گی
یہ شام بھی بے چراغ ہو گی!
ابھی تو صحرا کی دھوپ میں ننگے پاؤں چلنا پڑے گا مجھ کو
شجر ملے گا نہ سر پہ بادل کا سائباں کوئی تان دے گا
تری جھلک کا ابھی بہت انتظار کرنا پڑے گا مجھ کو
ابھی تو کچے گھڑے پہ دریا کو پار کرنا پڑے گا مجھ کو

مرے مسافر!
میں جانتی ہوں
سفر کی ساری صعوبتوں کو میں جانتی ہوں
مگر مری آنکھ میں جو یہ راکھ اڑ رہی ہے
یہ گرد جو میرے خال و خد پر جمی ہوئی ہے
قبائے تن تک نہیں رکی ہے
شکستگی میری روح میں ہے!
تھکن جو پچھلے سفر کی ہے
میری ہڈیوں میں اتر چکی ہے!

سیمیا

چارہ گر حیران ہے!

تپ سے تن جھلسا ہوا
نبض ناہموار، دل ڈوبا ہوا
ضعف سے سر اک طرف
زخم سارے تازہ رو
پھر بھی چہرہ پھول کی صورت مرا شاداب ہے!

اس کو کیا معلوم
کس شبنم نے اس پر رات بھر
اپنے لب رکھے رہے
اس کو کیا معلوم
کس بارش نے اس کو سارا دن
اپنے ہاتھوں پر رکھا
اس کو کیا معلوم
اک صحرا نصیب

اک توجہ کی نظر سے کس قدر سیراب ہے!

زندگی کا حسن سارا

روح کی ساری نمو

عشق کا اعجاز ہے!

خار سے لے کر

رگِ گل

اور رگِ جاں سے دلِ جاناں تلک

نامیہ کی ایک ہی قوت بروئے کار ہے

عشق اور اس کا فسوں!

"آگ کو گلزار کر سکتا ہے"

موت کو انکار کر سکتا ہے!

غزل

دیکھ کر دانہ جو آئے ہیں سرِشاخ پرند
رت بدلنے پہ تو یوں بھی نہیں رہنے والے

شہر ویرانی میں صحرا و بیاباں سے بڑھا
اب تو یاں اہلِ جنوں بھی نہیں رہنے والے

خاک ہو جائیں گے قاتل بھی یہاں تیغ بدست
اور غلطیدہ بخوں بھی نہیں رہنے والے

نیم بسمل ہی سہی ہیں تو میسر تجھ کو
پھر تو یہ صید زبوں بھی نہیں رہنے والے

وقت ایسا ہے کہ اب حشر ہے کچھ دیر کی بات
مطمئن اہل سکوں بھی نہیں رہنے والے

غزل

جز طلب اس سے کیا نہیں ملتا
وہ جو مجھ سے ذرا نہیں ملتا

جان لینا تھا اس سے مل کے ہمیں
بخت سے تو سوا نہیں ملتا

زخم کھلنے کے منتظر کب سے
اور لمسِ ہوا نہیں ملتا

کس قدر بدنصیب بادل ہیں
جن کو دستِ دعا نہیں ملتا

میرا مسلک نہیں قصاص مگر
کیا مجھے خوں بہا نہیں ملتا

بستیاں آخری دموں پر ہیں
اور حرفِ شفا نہیں ملتا

ایک آسیب کے مکان میں ہوں
اور ردِّ بلا نہیں ملتا

غزل

تاروں کے لئے بہت کڑی تھی
یہ رخصتِ ماہ کی گھڑی تھی

ہر دل پہ ہزار نیل نکلے
دنیا کسے پھول کی چھڑی تھی!

واں ڈھیر تھا پتھروں کا تیاّر
یاں پھول کی ایک پنکھڑی تھی

دریا مرے سامنے تھا لیکن
میں پیاس سے جاں بلب کھڑی تھی

دیکھوں گی میں آج اس کا چہرہ
کل خواب میں روشنی بڑی تھی

تھا جھوٹ امیر و تخت آرا
سچائی صلیب پر گڑی تھی

غزل

رخصت کی کسک رہی ہے اب تک
اک شام سلگ رہی ہے اب تک

شب کس نے یہاں قدم رکھا تھا
دہلیز چمک رہی ہے اب تک

ماتھے پہ وہ لب تھے ثانیہ بھر
اور روح مہک رہی ہے اب تک

دیکھا تھا یہ کس نظر سے اس نے
تصویر دمک رہی ہے اب تک

جو بات کہی نہیں تھی اس سے
لہجے میں کھنک رہی ہے اب تک

کب کا ہوا خالی ساغرِ شام
مے ہے کہ چھلک رہی ہے اب تک

بن عکس یہ کیسی جگمگاہٹ
شیشے سے جھلک رہی ہے اب تک

وہ چشم کہ باغ آشنا ہے
جنگل میں بھٹک رہی ہے اب تک

دونوں کے لبوں تک آتے آتے
اک بات اٹک رہی ہے اب تک

بارش کی ہے چاہ شاخ کو اور
بادل سے جھجک رہی ہے اب تک

شانوں پہ نہیں وہ ہاتھ لیکن
چادر سی سرک رہی ہے اب تک

غزل

لَو چراغوں کی کل شب اضافی رہی
روشنی تیرے چہرے کی کافی رہی

اپنے انجام تک آگئی زندگی
یہ کہانی مگر اختلافی رہی

ہے زمانہ خفا تو بجا ہے کہ میں
اس کی مرضی کے بالکل منافی رہی

ایسے محتاط ' ایسے کم آمیز سے
اک نظر بھی توجہ کی کافی رہی

صبح کیا فیصلہ حاکِم نو کرے
جشن کی رات تک تو معافی رہی

غزل

تارِ مژگاں نہیں مل رہا تھا
زخم کس یاد کا سِل رہا تھا

برف میں روشنی گھُل رہی تھی
وہ مجھے خواب میں مل رہا تھا

کچھ عجب روشنی باغ میں تھی
پھول کس رنگ کا کھِل رہا تھا

سامنے تھا وہ اور دونوں چپ تھے
اب نہ ہم تھے نہ وہ دل رہا تھا

رنگ و روغن کی باتیں محل میں
شہر بنیاد سے ہل رہا تھا

غزل

آنکھوں نے کیسے خواب تراشے ہیں ان دنوں
دل پر عجیب رنگ اترتے ہیں ان دنوں

رکھ اپنے پاس اپنے مہ و مہر اے فلک
ہم خود کسی کی آنکھ کے تارے ہیں ان دنوں

دستِ سحر نے مانگ نکالی ہے بارہا
اور شب نے آکے بال سنوارے ہیں ان دنوں

اس عشق نے ہمیں ہی نہیں معتدل کیا
اس کی بھی خوش مزاجی کے چرچے ہیں ان دنوں

اک خوشگوار نیند پہ حق بن گیا مرا
وہ رَت جگے اس آنکھ نے کاٹے ہیں ان دنوں

وہ قحط حسن ہے کہ سبھی خوش جمال لوگ
لگتا ہے کوہ قاف پہ رہتے ہیں ان دنوں

سنڈریلا-------Unvisited

کھلی آنکھوں یہ کیسا خواب میرے سامنے ہے
دیے آنگن سے لے کر آسماں تک
گلابِ تازہ کی خوشبو چمن سے صحن جاں تک
بلوریں جام
اور اس میں دمکتی سرخ مے
اور اس کے نشّے سے فروزاں ان کا چہرہ
ستاروں سے بنا میرا لبادہ
سراپا اضطراب اک شاہزادہ
فرش پر شمعیں جلاتا ایک وعدہ
دلوں کے وائلن پر
والز کرتے دو بدن
اور اس کے شانوں پر رکھے سر
زندگی سے
نیم سرگوشی میں اک ہی بات دہراتی ہوئی
خوشبوئے لب
اور اس کا جادو

گجر بجتے ہی آدھی رات کا
یہ خواب یکدم ٹوٹ جاتا ہے
ستاروں سے بنا ملبوس میرا
پھر خس و خاشاک ہو جاتا ہے
میرا رتھ اچانک ٹوٹ جاتا ہے
مری شیشے کی جوتی رقص گہ میں چھوٹ جاتی ہے!
مگر اگلی سحر
میری طرف
شاہی محل سے
کوئی قاصد
دوسرے پاؤں کی فرقت میں نہیں آتا!

نظم

چلو اس خواب کو ہم ترک کر دیں
اور آنکھوں کو یہ سمجھا دیں
کہ ہر تصویر میں ہلکا گلابی رنگ چاہے سے نہیں آتا
بہت سے نقش، نقاشِ ازل ایسے بناتا ہے
کہ جن کا حاشیہ گہرا سیہ
اور نقش ہلکا سرمئی رہتا ہے
اور جن پر کسی بھی زاویے سے چاند اترے
یہ کبھی روشن نہیں ہوتے
خدا کچھ کام آدھی رات کو کرتا ہے
جب اس کے پیالے میں
سیاہی کے سوا کچھ بھی نہیں ہوتا
یہ خاکہ بھی
کسی ایسی ہی ساعت میں بنا ہو گا

ہماری آنکھ میں جو خواب اترا تھا
بہت خوش رنگ لگتا تھا

مگر اس کے دمکنے میں
کئی آنکھیں لہو ہوتیں
کتابوں اور پھولوں سے سجے جس گھر کے آنگن میں
ہم اپنے آپ کو کھلتے ہوئے محسوس کرتے تھے
وہاں اک اور گھر بنیاد سے یوں سر اٹھاتا تھا
کہ ہم اندر سے ہل جاتے
مگر چپ چاپ رہتے تھے
یہ چپ دیمک کی صورت ہم کو اک دن چاٹ جاتی!

تمہارے دکھ سے میں واقف ہوں
اور اپنے مقدر کی لکیروں کی بھی محرم ہوں
ہمارے بس میں رنگوں کا چناؤ ہے
نہ خط کا
سو اس تصویر کو تحلیل کر دیں
ہم اپنا کینوس تبدیل کر لیں!

نظم

منوہر

کیا واروں تجھ پر
میری جیون تھالی میں تو
شیش نہیں کوئی دیوٹ
بس نیناں رہتے ہیں
جلے ہوئے سپنوں کا تٹ
ماتھے ترے کیا تلک لگاؤں
راکھ بھئی مری مانگ
اوک میں تیری کیا جل ڈاروں
میں سمپورن پیاس!
کچھ شبدوں کے موتی ہیں
پر کیا اس چندر مکھ آگے
تیری جنم گرہ میں موہن

کونسا پھول میں ٹانکوں
من بگیا سونی ہے
اور پرائے پھولوں پر ہے
کیا میرا ادھیکار
بس اک آتما رہتی ہے
جو دان کروں تجھ پر!
منوہر
کیا واروں تجھ پر؟

نظم

میں اپنی پیاس پر خاموش تھی
اور ریگِ صحرا کی طرح سے زندگی کو دھوپ کا ٹکڑا سمجھتی تھی
کبھی سیراب ہونے کی تمنا نے
بدن میں سر اٹھایا بھی
تو اپنے دل سے میں نے معذرت کرلی
کہا اس سے
کہ اندر آگ کیسی ہی بھڑکتی ہو
مجھے بارش کی جانب آنکھ اٹھا کر دیکھنے کا حق نہیں ہے
زباں پر آبلے پڑتے رہیں
لیکن مجھے شبنم نہیں چکھنی
مجھے بادل کے ہاتھوں سے کوئی تحفہ نہیں لینا
نمی کی ایک ہی صورت ہے میری زندگی میں
اور وہ آنسو ہے!

مگر جب سے کسی لہجے کے نم نے
میرے دل کی ریت کو آ کر چھوا ہے
مرے اندر
مکمل بھیگ جانے کی تمنّا جاگ اٹھی ہے
لہو میں اب مرے بس آتشِ سیاّل ہے
اور جسم انگارے کی طرح سے دہکتا ہے
مگر کیا بخت ہے میرا
کہ دریا چوم کر میرا کنارہ
چھوڑ دیتا ہے
سراپا تشنگی ہوں
اور بھرا پیالہ لبوں تک لا کے کوئی
کھینچ لیتا ہے!

غزل

ایک ہی ہاتھ میں سب کچھ سمٹ آیا شاید
بادشاہت کا زمانہ پلٹ آیا شاید

دل کو دنیا کی ضرورت ہی نہیں پڑنے دی
تیرے لشکر سے اکیلے نبٹ آیا شاید

دفن کر آئی میں جنگل میں خزانہ لیکن
سانپ سا پھر کوئی دل سے لپٹ آیا شاید

اس قدر بھیڑ تھی اس بار بھی رستے میں ترے
کوئی چہرہ، کسی کھڑکی سے ہٹ آیا شاید

لوٹنے والے کو پہچاننا مشکل ٹھہرا
ایک چہرہ' کئی چہروں میں بٹ آیا شاید

کسی صورت سے ابھی سر کو بچا رکھا تھا'
جنگ بے صرفہ میں لیکن وہ کٹ آیا شاید

نثری نظم

ان دنوں

میری اپنے آپ سے بول چال بند ہے!

میرے اندر ایک بانجھ غصّہ

پھنکارتا رہتا ہے

نہ مجھے ڈستا ہے

نہ میرے گرد اپنی گرفت ڈھیلی کرتا ہے

نینوا کی سرزمین

ایک بار پھر سرخ ہے

فرات کے پانی پر

ابنِ زیاد کے طرفداروں کا ایک بار پھر قبضہ ہے

زمین اور آسمان

ایک بار پھر ششماہے کا لہو

وصول کرنے سے انکاری ہیں

اور میرے چہرے پر اب مزید لہو کی جگہ نہیں!
فاتح فوج روشنی اور آگ کے فرق کو نہیں سمجھتی!
صحرا کی رات کاٹنے کے لئے انہیں الاؤ کی ضرورت تھی
سو انہوں نے میرے کتب خانے جلا دیے!
لیکن میں احتجاج بھی نہیں کر سکتی

میرے بالوں میں سرخ اسکارف بندھا ہے
اور میرے گلاس میں کوکا کولا ہنس رہا ہے
میرے سامنے ڈالر کی ہڈی پڑی ہوئی ہے!

تمہاری سالگرہ پر

یہ چاند اور یہ ابر رواں گزرتا رہے
جمالِ شام تہہ آسماں گزرتا رہے

بھرا رہے تری خوشبو سے تیرا صحنِ چمن
بس ایک موسِم عنبر فشاں گزرتا رہے

سماعتیں ترے لہجے سے پھول چنتی رہیں
دلوں کے ساز پہ تو نغمہ خواں گزرتا رہے

خدا کرے تری آنکھیں ہمیشہ ہنستی رہیں
دیارِ وقت سے تو شادماں گزرتا رہے

میں تجھکو دیکھ نہ پاؤں تو کچھ ملال نہیں
کہیں بھی ہو تو' ستارہ نشاں گزرتا رہے

میں مانگتی ہوں تری زندگی قیامت تک
ہوا کی طرح سے تو جاوداں گزرتا رہے

مرا ستارہ کہیں ٹوٹ کر بکھر جائے
فلک سے تیرا خطِ کہکشاں گزرتا رہے

میں تیری چھاؤں میں کچھ دیر بیٹھ لوں اور پھر
تمام راستہ بے سائباں گزرتا رہے

یہ آگ مجھکو ہمیشہ کئے رہے روشن
مرے وجود سے تو شعلہ ساں گزرتا رہے

میں تجھ کو دیکھ سکوں آخری بصارت تک
نظر کے سامنے بس اک سماں گزرتا رہے

ہمارا نام کہیں تو لکھا ہوا ہوگا
مہ و نجوم سے یہ خاکداں گزرتا رہے

میں تیرا ساتھ نہ دے پاؤں پھر بھی تیرا سفر
گلاب و خواب کے ہی درمیاں گزرتا رہے

میں تیرے سینے پہ سر رکھ کے وقت بھول گئی
خیالِ تیزئ عمرِ رواں گزرتا رہے!

سلام

گرچہ لکھی ہوئی تھی شہادت امام کی
لیکن مرے حسینؓ نے حجت تمام کی

زینب کی بے ردائی نے سر میرا ڈھک دیا
آغازِ صبحِ نو ہوئی وہ شام، شام کی

اک خوابِ خاص چشمِ محمدؐ میں تھا چھپا
تعبیر نورِ عینِ محمدؐ نے عام کی

بچوں کی پیاس مالکِ کوثر پہ شاق تھی
ساقی کو ورنہ مے کی ضرورت نہ جام کی

حر سا نصیب بادشہوں کو نہیں نصیب
آقا سے مل رہی تھی گواہی غلام کی

دریا پہ تشنہ لب ہیں پہ صحرا میں شاد کام
دنیا عجب ہے ان کے سفر اور قیام کی

دے کر رضا جو چہرۂ شبیر زرد ہے
تھی التجائے جنگ یہ کس لالہ فام کی